شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾
وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ ع ۵ ۳۶ ۹

ہمارا کوئی سفارشی ہے[۷۰] اور نہ کوئی جگری دوست۔[۷۱] کاش ہمیں ایک دفعہ پھر پلٹنے کا موقع مل جائے تو ہم مومن ہوں۔[۷۲]،،
یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے،[۷۳] مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب
زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ع قومِ نوحؑ[۷۴] نے رسولوں کو جھٹلایا۔[۷۵]

کہاں لے آئے ہیں تو یہی معتقدین ان کو مجرم ٹھیرائیں گے اور ان پر لعنت بھیجیں گے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ عالمِ آخرت کا یہ عبرت ناک نقشہ کھینچا گیا ہے تاکہ اندھی تقلید کرنے والے دنیا میں آنکھیں کھولیں اور کسی کے پیچھے چلنے سے پہلے دیکھ لیں کہ وہ ٹھیک بھی جا رہا ہے یا نہیں۔ {ملاحظہ ہو سورۂ اعراف، آیت ۳۸۔ حٰم السجدہ، آیت ۲۹۔ الاحزاب، آیت ۶۷، ۶۸}

[۷۰] یعنی جنہیں ہم دنیا میں سفارشی سمجھتے تھے اور جن کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ تھا کہ ان کا دامن جس نے تھام لیا بس اس کا بیڑا پار ہے، ان میں سے آج کوئی بھی سعی سفارش کے لیے زبان کھولنے والا نہیں ہے۔

[۷۱] یعنی کوئی ایسا بھی نہیں ہے جو ہمارا غم خوار اور ہمارے لیے کڑھنے والا ہو، چاہے ہم کو چھڑا نہ سکے مگر کم از کم اسے ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی ہی ہو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الزخرف، حاشیہ ۵۹)

[۷۲] اس تمنا کا جواب بھی قرآن میں دے دیا گیا ہے کہ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (الانعام، آیت ۲۸) ''اگر انہیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیج دیا جائے تو وہی کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے۔'' {مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ مومنون، حواشی ۹۰ تا ۹۲}

[۷۳] حضرت ابراہیمؑ کے اس قصے میں نشانی کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ مشرکین عرب اور بالخصوص قریش کے لوگ ایک طرف تو حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کا دعویٰ اور ان کے ساتھ انتساب پر فخر کرتے ہیں مگر دوسری طرف اسی شرک میں مبتلا ہیں جس کے خلاف جدوجہد کرتے اُن کی عمر بیت گئی تھی۔ دوسرا پہلو اس قصہ میں نشانی کا یہ ہے کہ قومِ ابراہیمؑ دنیا سے مٹ گئی اور ایسی مٹی کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا، اس میں سے اگر کسی کو بقا نصیب ہوا تو صرف ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مبارک فرزندوں (اسماعیلؑ و اسحاقؑ) کی اولاد ہی کو نصیب ہوا۔

[۷۴] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات ۵۹ تا ۶۴۔ یونس، آیات ۷۱ تا ۷۳۔ ہود، آیات ۲۵ تا ۴۸۔ بنی اسرائیل، آیت ۳۔ الانبیاء، آیات ۷۶، ۷۷۔ المومنون، آیات ۲۳ تا ۳۰۔ الفرقان، آیت ۳۷۔

[۷۵] اگرچہ انہوں نے ایک ہی رسول کو جھٹلایا تھا، لیکن چونکہ رسول کی تکذیب درحقیقت اُس دعوت اور پیغام کی تکذیب ہے جسے لے کر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے، اس لیے جو شخص یا گروہ کسی ایک رسول کا بھی انکار کر دے وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تمام رسولوں کا منکر ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۰۷﴾
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ
اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ
لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

یاد کرو جب کہ اُن کے بھائی نوحؑ نے ان سے کہا تھا" کیا تم ڈرتے نہیں ہو[۷۶]؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں،[۷۷] لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔[۷۸] میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمہ ہے۔[۷۹] پس تم اللہ سے ڈرو اور (بے کھٹکے) میری اطاعت کرو۔[۸۰]" انہوں نے جواب دیا" کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے[۸۱]؟" نوحؑ نے کہا" میں کیا جانوں کہ ان کے عمل کیسے ہیں،

[۷۶] حضرت نوحؑ کے اس ارشاد کا مطلب محض خوف نہیں بلکہ اللہ کا خوف ہے۔ {مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ المومنون، حاشیہ ۲۵}

[۷۷] اس کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ خدا کی طرف سے مجھ پر نازل ہوتا ہے وہی بے کم و کاست تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ میں ایک ایسا رسول ہوں جسے تم پہلے سے ایک امین اور راست باز آدمی کی حیثیت سے جانتے ہو۔ جب میں خلق کے معاملے میں خیانت کرنے والا نہیں ہوں تو خدا کے معاملے میں کیسے خیانت کر سکتا ہوں۔ لہٰذا تمہیں باور کرنا چاہیے کہ جو کچھ میں خدا کی طرف سے پیش کر رہا ہوں اس میں بھی ویسا ہی امین ہوں جیسا دنیا کے معاملات میں آج تک تم نے مجھے امین پایا ہے۔

[۷۸] یعنی میرے رسولِ امین ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم دوسرے سب مطاعوں کی اطاعت چھوڑ کر صرف میری اطاعت کرو، کیونکہ میں خداوند عالم کی مرضی کا نمائندہ ہوں، میری اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور میری نافرمانی محض میری ذات کی نافرمانی نہیں بلکہ براہِ راست خدا کی نافرمانی ہے۔

[۷۹] یہ اپنی صداقت پر حضرت نوحؑ کی دوسری دلیل ہے۔ {اس کا مطلب} یہ ہے کہ میں ایک بے غرض آدمی ہوں، تم کسی ایسے ذاتی فائدے کی نشان دہی نہیں کر سکتے جو اس کام سے مجھے حاصل ہو رہا ہو یا جس کے حصول کی میں کوشش کر رہا ہوں۔ اس بے غرضانہ طریقہ سے کسی ذاتی نفع کے بغیر جب میں اس دعوتِ حق کے کام میں شب و روز اپنی جان کھپا رہا ہوں، تو تمہیں باور کرنا چاہیے کہ میں اس کام میں مخلص ہوں، کوئی نفسانی جذبہ اس کا محرک نہیں ہے کہ اس کی خاطر میں جھوٹ گھڑ کر لوگوں کو دھوکا دوں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، المومنون، حاشیہ ۷۰)

[۸۰] اس فقرے کو یہاں ایک دوسری مناسبت سے دہرایا گیا ہے۔ اوپر اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ سے فَاتَّقُوا اللّٰهَ کے فقرے کی مناسبت یہ تھی کہ جو شخص اللہ کی طرف سے ایک امانت دار رسول ہے، اُسے جھٹلاتے ہوئے خدا سے ڈرو۔ اور یہاں مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ سے اس فقرے کی مناسبت یہ ہے کہ جو شخص اپنے کسی ذاتی فائدے کے بغیر محض اصلاحِ خلق کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ کام کر رہا ہے اس کی نیت پر حملہ کرتے ہوئے خدا سے ڈرو۔

[۸۱] یہ لوگ جنہوں نے حضرت نوحؑ کو دعوتِ حق کا یہ جواب دیا، ان کی قوم کے سردار، شیوخ اور اشراف تھے، جیسا کہ

اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۴﴾
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۱۵﴾ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰنُوْحُ

ان کا حساب تو میرے رب کے ذمہ ہے، کاش تم کچھ شعور سے کام لو۔[۸۲] میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو ایمان لائیں ان کو میں دھتکار دوں۔ میں تو بس ایک صاف صاف متنبہ کر دینے والا آدمی ہوں۔[۸۳]" انہوں نے کہا" اے نوحؑ، اگر تو باز نہ آیا تو

{سورۂ ہود، آیت ۲۷ میں صراحت سے فرمایا گیا ہے}۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے زیادہ تر غریب لوگ، چھوٹے چھوٹے پیشہ ور لوگ، یا ایسے نوجوان تھے جن کی قوم میں کوئی حیثیت نہ تھی۔

بعینہٖ یہی بات قریش کے کفار نبی ﷺ کے متعلق کہتے تھے کہ ان کے پیرو یا تو غلام اور غریب لوگ ہیں یا چند نادان لڑکے، قوم کے اکابر اور معززین میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ گویا ان لوگوں کا طرزِ فکر یہ تھا کہ حق صرف وہ ہے جسے قوم کے بڑے لوگ حق مانیں کیونکہ وہی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، رہے چھوٹے لوگ، تو ان کا چھوٹا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے عقل اور ضعیف الرائے ہیں، اس لیے ان کا کسی بات کو مان لینا اور بڑے لوگوں کا رد کر دینا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک بے وزن بات ہے۔

[۸۲] یہ ان کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ {حضرت نوحؑ اس جواب میں فرماتے ہیں} کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جو شخص میرے پاس آ کر ایمان لاتا ہے اور ایک عقیدہ قبول کر کے اس کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے، اس کے اس فعل کی تہ میں کیا محرکات کام کر رہے ہیں اور وہ کتنی کچھ قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کا دیکھنا اور ان کا حساب لگانا تو خدا کا کام ہے، میرا اور تمہارا کام نہیں ہے۔

[۸۳] یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ ان کے اعتراض میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ ایمان لانے والوں کا گروہ چونکہ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات پر مشتمل ہے، اس لیے اونچے طبقوں میں سے کوئی شخص اس زمرے میں شامل ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔ حضرت نوحؑ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ میں آخر یہ غیر معقول طرزِ عمل کیسے اختیار کر سکتا ہوں کہ جو لوگ میری بات نہیں مانتے ان کے تو پیچھے پھرتا رہوں اور جو میری بات مانتے ہیں انہیں دھکے دے کر نکال دوں۔ میری حیثیت تو ایک ایسے بے لاگ آدمی کی ہے جس نے علی الاعلان کھڑے ہو کر پکار دیا ہے کہ جس طریقے پر تم لوگ چل رہے ہو یہ باطل ہے اور اس پر چلنے کا انجام تباہی ہے، اور جس طریقے کی طرف میں رہنمائی کر رہا ہوں اسی میں تم سب کی نجات ہے۔ اب جس کا جی چاہے میری اس تنبیہ کو قبول کر کے سیدھے راستے پر آئے اور جس کا جی چاہے آنکھیں بند کر کے تباہی کی راہ چلتا رہے۔

ٹھیک یہی معاملہ ان آیات کے نزول کے زمانے میں نبی ﷺ اور کفارِ مکہ کے درمیان چل رہا تھا۔ {ملاحظہ ہو الانعام، آیت ۵۲۔ سورۂ عبس، آیت ۵۔ ۱۳} اور اسی کو نگاہ میں رکھنے سے یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے سرداروں کی یہ گفتگو یہاں کیوں سنائی جا رہی ہے۔

النصف

لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾
فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾
فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ
الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾
ع ۱۸ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾ كَذَّبَتْ عَادُ ِالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ

پھٹکارے ہوئے لوگوں میں شامل ہوکر رہے گا۔[۸۴]'' نوحؑ نے دعا کی ''اے میرے رب، میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا۔[۸۵] اب میرے اور ان کے درمیان دوٹوک فیصلہ کردے اور مجھے اور جو مومن میرے ساتھ ہیں ان کو نجات دے۔[۸۶]'' آخر کار ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ایک بھری ہوئی کشتی میں بچالیا۔[۸۷] اور اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کردیا۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ع

عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔[۸۸]

[۸۴] اصل الفاظ ہیں لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ۔ اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم کو پتھر مار مار کر ہلاک کردیا جائے گا۔ دوسرے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ تم پر ہر طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ کی جائے گی، جہاں جاؤ گے دھتکارے اور پھٹکارے جاؤ گے۔

[۸۵] یعنی آخری اور قطعی طور پر جھٹلا دیا ہے جس کے بعد اب کسی تصدیق و ایمان کی امید باقی نہیں رہی۔ ظاہر کلام سے کوئی شخص اس شبہ میں نہ پڑے کہ بس پیغمبر اور سردارانِ قوم کے درمیان اوپر کی گفتگو ہوئی اور ان کی طرف سے پہلی ہی تکذیب کے بعد پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کے حضور رپورٹ پیش کردی کہ یہ میری نبوت نہیں مانتے، اب آپ میرے اور ان کے مقدمہ کا فیصلہ فرمادیں۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اُس طویل کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے جو حضرت نوحؑ کی دعوت اور ان کی قوم کے اصرار علی الکفر کے درمیان صدیوں برپا رہی۔ {ملاحظہ ہو سورۂ عنکبوت، آیت ۱۴۔ سورۂ نوح، آیت ۲۷۔ سورۂ ہود، آیت ۳۶}

[۸۶] یعنی فیصلہ اس شکل میں نافذ فرما کہ باطل پرست تباہ کردیے جائیں اور حق پرست بچالیے جائیں۔ یہ الفاظ کہ ''مجھے اور میرے مومن ساتھیوں کو بچالے'' خود بخود اپنے اندر یہ مفہوم رکھتے ہیں کہ باقی لوگوں پر عذاب نازل کر اور انہیں حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دے۔

[۸۷] ''بھری ہوئی کشتی'' سے مراد یہ ہے کہ وہ کشتی ایمان لانے والے انسانوں اور تمام جانوروں سے بھر گئی تھی جن کا ایک ایک جوڑا ساتھ رکھ لینے کی ہدایت فرمائی گئی تھی۔ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ ہود، آیت ۴۰۔

[۸۸] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات ۶۵ تا ۷۲۔ ہود، ۵۰ تا ۶۰۔ مزید برآں اس قصے کی تفصیلات کے لیے قرآن مجید کے حسب ذیل مقامات بھی نگاہ میں رہیں: حٰم السجدہ، آیات ۱۳-۱۶۔ الاحقاف، ۲۱-۲۶۔ الذاریات، ۴۱-۴۵۔ القمر ۱۸-۲۲۔ الحاقہ، ۴-۸۔ الفجر ۶-۸۔

قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۲۵﴾
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ
اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۷﴾ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾
وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ

یاد کرو جب کہ ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا تھا[۸۹] ”کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمہ ہے۔ یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو،[۹۰] اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔[۹۱] اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبار بن کر ڈالتے ہو۔[۹۲]

[۸۹] حضرت ہود علیہ السلام کی اس تقریر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس قوم کے متعلق وہ معلومات ہماری نگاہ میں رہیں جو قرآن مجید نے مختلف مقامات پر ہمیں بہم پہنچائی ہیں۔ اُن میں بتایا گیا ہے کہ:

قومِ نوح کی تباہی کے بعد دنیا میں جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی۔ (الاعراف۔ آیت ۶۹)

جسمانی حیثیت سے یہ بڑے تنومند اور زور آور لوگ تھے۔ (الاعراف، آیت ۶۹)

اپنے دَور میں یہ بے نظیر قوم تھی۔ کوئی دوسری قوم اس کی ٹکر کی نہ تھی۔ (الفجر، آیت ۸)

اس کا تمدن بڑا شان دار تھا، اونچے اونچے ستونوں کی بلند و بالا عمارتیں بنانا اس کی وہ خصوصیت تھی جس کے لیے وہ اس وقت کی دنیا میں مشہور تھی۔ (الفجر، آیات ۶، ۷)

اس مادی ترقی اور جسمانی زور آوری نے ان کو سخت متکبر بنا دیا تھا اور انہیں اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ تھا۔ (حٰمٓ السجدہ۔ آیت ۱۵)

ان کا سیاسی نظام چند بڑے بڑے جباروں کے ہاتھ میں تھا جن کے آگے کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ (ہود۔ آیت ۵۹)

مذہبی حیثیت سے یہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، بلکہ شرک میں مبتلا تھے۔ ان کو اس بات سے انکار تھا کہ بندگی صرف اللہ کی ہونی چاہیے۔ (الاعراف۔ آیت ۷۰)

اِن خصوصیات کو نظر میں رکھنے سے حضرت ہودؑ کی یہ تقریر دعوت اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔

[۹۰] یعنی محض اپنی عظمت و خوش حالی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایسی عالی شان عمارتیں تعمیر کرتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں۔

[۹۱] یعنی تمہاری دوسری قسم کی تعمیرات ایسی ہیں جو اگرچہ استعمال کے لیے ہیں، مگر ان کو اس قدر شان دار، مزین اور مستحکم بناتے ہو جیسے دنیا میں ہمیشہ رہنے کا سامان کر رہے ہو۔

[۹۲] یعنی اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے میں تو تم اس قدر غلو کر گئے ہو۔ لیکن تمہارا معیارِ انسانیت اتنا گرا ہوا ہے کہ کمزوروں کے لیے تمہارے دلوں میں کوئی رحم نہیں، گرد و پیش کی ضعیف قومیں ہوں یا خود اپنے ملک کے پست طبقات، سب تمہارے جبر و ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔

جَبَّارِیْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۳۱﴾ وَاتَّقُوا الَّذِیْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِیْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾ اِنِّیْٓ
اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۳۵﴾ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَوَعَظْتَ
اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِیْنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَمَا
نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿۱۳۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً وَمَا
كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۹﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۴۰﴾ كَذَّبَتْ ع ۱۸ ۱۱

پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اُس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا ہے جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیے، اولادیں دیں، باغ دیے اور چشمے دیے۔ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔'' انہوں نے جواب دیا'' تو نصیحت کر یا نہ کر، ہمارے لیے سب یکساں ہے۔ یہ باتیں تو یوں ہی ہوتی چلی آئی ہیں۔[۹۳] اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں۔'' آخر کار انہوں نے اُسے جھٹلا دیا اور ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔[۹۴] یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ع

[۹۳] اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہ آج کوئی نئی چیز نہیں ہے، صدیوں سے ہمارے باپ دادا یہی کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہی ان کا دین تھا، یہی ان کا تمدن تھا اور ایسے ہی ان کے اخلاق اور معاملات تھے۔ کون سی آفت اُن پر ٹوٹ پڑی تھی کہ اب ہم اس کے ٹوٹ پڑنے کا اندیشہ کریں۔ اس طرزِ زندگی میں کوئی خرابی ہوتی تو پہلے ہی وہ عذاب آ چکا ہوتا جس سے تم ڈراتے ہو۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو باتیں تم کر رہے ہو ایسی ہی باتیں پہلے بھی بہت سے مذہبی خبطی اور اخلاق کی باتیں بگھارنے والے کرتے رہے ہیں، مگر دنیا کی گاڑی جس طرح چل رہی تھی اسی طرح چلے جا رہی ہے۔ تم جیسے لوگوں کی باتیں نہ ماننے کا یہ نتیجہ کبھی برآمد نہ ہوا کہ یہ گاڑی کسی صدمہ سے دوچار ہو کر اُلٹ گئی ہوتی۔

[۹۴] اس قوم کے ہلاک ہونے کی جو تفصیل قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اچانک زور کی آندھی اُٹھی۔ یہ لوگ دور سے اس کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھ کر سمجھے کہ گھٹا چھائی ہے۔ خوشیاں منانے لگے کہ اب خوب بارش ہوگی۔ مگر وہ تھا خدا کا عذاب۔ آٹھ دن اور سات راتوں تک مسلسل ایسی طوفانی ہوا چلتی رہی جس نے ہر چیز کو تباہ کر ڈالا۔ اس کے زور کا یہ عالم تھا کہ اس نے آدمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر پھینک دیا۔ اس کی گرمی و خشکی کا یہ حال تھا کہ جس چیز پر گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔ اور یہ طوفان اس وقت تک نہ تھما جب تک اس ظالم قوم کا ایک ایک متنفس ختم نہ ہو گیا۔ بس ان کی بستیوں کے کھنڈر ہی ان کے انجام کی داستان سنانے کے لیے کھڑے رہ گئے۔ اور آج کھنڈر بھی باقی نہیں ہیں۔ احقاف کا پورا علاقہ ایک خوف ناک ریگستان بن چکا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الاحقاف، حاشیہ ۲۵)

ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾
اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ
مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَا هٰهُنَآ
اٰمِنِیْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ ﴿۱۴۸﴾
وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ ﴿۱۴۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾

ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔[۹۵] یاد کرو جب کہ ان کے بھائی صالحؑ نے ان سے کہا ''کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔[۹۶] لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم اُن سب چیزوں کے درمیان، جو یہاں ہیں، بس یوں ہی اطمینان سے رہنے دیے جاؤ گے؟[۹۷] اِن باغوں اور چشموں میں؟ اِن کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں[۹۸]؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ اُن میں عمارتیں بناتے ہو۔[۹۹] اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

[۹۵] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات ۷۳ تا ۷۹۔ ہود، ۶۱-۶۸۔ الحجر، ۸۰-۸۴۔ بنی اسرائیل، ۵۹۔
اس قوم کے متعلق قرآن مجید میں مختلف مقامات پر جو تصریحات کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عاد کے بعد جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی۔ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ (الاعراف، آیت: ۷۴) مگر اس کی تمدنی ترقی نے بھی بالآخر وہی شکل اختیار کی جو عاد کی ترقی نے کی تھی، یعنی معیارِ زندگی بلند سے بلند تر اور معیارِ آدمیت پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف میدانی علاقوں میں عالی شان قصر اور پہاڑوں میں ایلورا اور اجنتا کے غاروں جیسے مکان بن رہے تھے۔ دوسری طرف معاشرے میں شرک و بت پرستی کا زور تھا اور زمین ظلم و ستم سے لبریز ہو رہی تھی۔ قوم کے بدترین مفسد لوگ اس کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ اونچے طبقے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں سرشار تھے۔ حضرت صالحؑ کی دعوتِ حق نے اگر اپیل کیا تو نچلے طبقے کے کمزور لوگوں کو کیا۔ اونچے طبقوں نے اسے ماننے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ''جس چیز پر تم ایمان لائے ہو اس کو ہم نہیں مان سکتے۔''

[۹۶] حضرت صالحؑ کی امانت و دیانت اور غیر معمولی قابلیت کی شہادت خود اس قوم کے لوگوں کی زبان سے قرآن مجید ان الفاظ میں نقل کرتا ہے: قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا (ہود۔ آیت ۶۲) ''انہوں نے کہا اے صالحؑ، اس سے پہلے تو تم ہمارے درمیان ایسے آدمی تھے جس سے ہماری بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔''

[۹۷] یعنی کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ تمہارا یہ عیش دائمی اور ابدی ہے؟ کیا اس کو کبھی زوال آنا نہیں ہے؟ کیا تم سے کبھی ان نعمتوں کا حساب نہ لیا جائے گا۔

[۹۸] اصل میں لفظ هَضِیْم استعمال ہوا ہے جس سے مراد کھجور کے ایسے خوشے ہیں جو پھلوں سے لد کر جھک گئے ہوں اور جن کے پھل پکنے کے بعد نرمی اور رطوبت کی وجہ سے پھٹے پڑتے ہوں۔

[۹۹] جس طرح عاد کے تمدن کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ اُونچے اُونچے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے، اسی طرح ثمود کے تمدن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عمارتیں بناتے تھے۔ {ملاحظہ ہو الفجر، آیت ۹}

وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا
يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُنَا ۖ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ

اُن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔[۱۰۰]'' اُنہوں نے جواب دیا'' تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے۔[۱۰۱] تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے۔ لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے[۱۰۲]۔'' صالحؑ نے کہا'' یہ اُونٹنی ہے۔[۱۰۳]

اس کے علاوہ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہاں میدانی علاقوں میں بھی بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے تھے۔ (الاعراف، آیت ۷۴) اور ان تعمیرات کی غرض و غایت کیا تھی؟ قرآن اس پر لفظ فٰرِهِيْنَ سے روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ اپنی بڑائی، اپنی دولت و قوت اور اپنے کمالاتِ فن کی نمائش کے لیے تھا، کوئی حقیقی ضرورت ان کے لیے داعی نہ تھی۔

ثمود کی ان عمارتوں میں سے کچھ اب بھی باقی ہیں جنہیں ۱۹۵۹ کے دسمبر میں میں نے خود دیکھا ہے۔ یہ جگہ مدینہ طیبہ اور تبوک کے درمیان حجاز کے مشہور مقام العلاء (جسے عہد نبوی میں وادی القریٰ کہا جاتا تھا) سے چند میل کے فاصلے پر بجانب شمال واقع ہے۔ آج بھی اس جگہ کو مقامی باشندے الحجر اور مدائن صالح کے ناموں ہی سے یاد کرتے ہیں۔ اس علاقے میں جب ہم داخل ہوئے تو العلاء کے قریب پہنچتے ہی ہر طرف ہمیں ایسے پہاڑ نظر آئے جو بالکل کھیل کھیل ہو گئے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی سخت ہول ناک زلزلے نے انہیں سطح زمین سے چوٹی تک جھنجوڑ کر قاش قاش کر رکھا ہے۔ اسی طرح کے پہاڑ ہمیں مشرق کی طرف العلاء سے خیبر جاتے ہوئے تقریباً ۵۰ میل تک اور شمال کی طرف ریاست اردن کے حدود میں ۳۰-۴۰ میل اندر تک ملتے چلے گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تین چار سو میل لمبا اور ۱۰۰ میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے ایک زلزلۂ عظیم نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

[۱۰۰] یعنی اپنے اُن امراء و رؤساء اور ان رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو یہ مسرف لوگ ہیں، اخلاق کی ساری حدیں پھاند کر شتر بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ تمہارے لیے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرو اور مفسدوں کی اطاعت چھوڑ کر میری اطاعت کرو، کیونکہ میں خدا کا رسول ہوں۔ یہ تھا وہ مختصر منشور جو حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس میں صرف مذہبی تبلیغ ہی نہ تھی، تمدنی و اخلاقی اصلاح اور سیاسی انقلاب کی دعوت بھی ساتھ ساتھ موجود تھی۔

[۱۰۱] ''سحر زدہ'' یعنی دیوانہ و مجنون، جس کی عقل ماری گئی ہو۔

[۱۰۲] یعنی اگر تو اپنے مامور من اللہ اور مرسل من جانب اللہ ہونے کے دعوے میں سچا ہے تو کوئی ایسا محسوس معجزہ پیش کر جس سے ہمیں یقین آ جائے کہ واقعی کائنات کے خالق اور زمین و آسمان کے مالک نے تجھ کو ہمارے پاس بھیجا ہے۔

[۱۰۳] معجزے کے مطالبے پر اونٹنی پیش کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض ایک عام اونٹنی نہ تھی، بلکہ ضرور اس کی پیدائش اور اس کے ظہور میں یا اس کی خلقت میں کوئی ایسی چیز تھی جسے معجزے کی طلب پر پیش کرنا معقول ہوتا۔ یہ بات یہاں تو صرف سیاقِ کلام ہی کے اقتضاء سے سمجھ میں آتی ہے، لیکن دوسرے مقامات پر قرآن میں صراحت کے ساتھ اس اونٹنی کے وجود کو معجزہ کہا گیا ہے۔ سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں فرمایا گیا هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً، '' یہ اللہ کی اُونٹنی تمہارے لیے نشانی کے طور پر ہے۔''

لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ
عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ فَاَخَذَهُمُ
الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَاِنَّ
رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ اِذْ ع ۸ ۱۹ ۱۲

ایک دن اس کے پینے کا ہے اور ایک دن تم سب کے پانی لینے کا۔[۱۰۴] اس کو ہرگز نہ چھیڑنا ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آلے گا۔'' مگر انہوں نے اس کی کوچیں کاٹ دیں[۱۰۵] اور آخر کار پچھتاتے رہ گئے۔ عذاب نے انھیں آلیا۔[۱۰۶] یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ع لوطؑ کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔[۱۰۷]

[۱۰۴] یعنی ایک دن تنہا یہ اُونٹنی تمہارے کنووں اور چشموں سے پانی پیے گی اور ایک دن ساری قوم کے آدمی اور جانور پئیں گے۔ خبردار، اس کی باری کے دن کوئی شخص پانی لینے کی جگہ پھٹکنے نہ پائے۔ یہ چیلنج بجائے خود نہایت سخت تھا۔ لیکن عرب کے مخصوص حالات میں تو کسی قوم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا چیلنج ہو نہیں سکتا تھا۔ وہاں تو پانی ہی کے مسئلے پر خون خرابے ہو جاتے تھے، لیکن حضرت صالحؑ نے تنہا اُٹھ کر یہ چیلنج اپنی قوم کو دیا اور قوم نے نہ صرف یہ کہ اس کو کان لٹکا کر سنا بلکہ بہت دنوں تک ڈر کے مارے وہ اس کی تعمیل بھی کرتی رہی۔

[۱۰۵] یہ مطلب نہیں ہے کہ جس وقت انہوں نے حضرت صالحؑ سے یہ چیلنج سنا اسی وقت وہ اونٹنی پر پل پڑے اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں، بلکہ کافی مدت تک یہ اونٹنی ساری قوم کے لیے ایک مسئلہ بنی رہی۔ لوگ اس پر دلوں میں اونٹتے رہے، مشورے ہوتے رہے، اور آخر کار ایک من چلے سردار نے اس کام کا بیڑا اٹھایا کہ وہ قوم کو اس بلا سے نجات دلائے گا۔ ملاحظہ ہو سورۂ شمس، آیت ۱۲، سورۂ قمر، آیت ۲۹۔

[۱۰۶] قرآن میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب اونٹنی مار ڈالی گئی تو حضرت صالحؑ نے اعلان کیا: تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ، ''تین دن اپنے گھروں میں مزے کر لو'' (ہود، آیت ۶۵)۔ اس نوٹس کی مدت ختم ہونے پر رات کے پچھلے پہر صبح کے قریب ایک زبردست دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ایسا سخت زلزلہ آیا جس نے آن کی آن میں پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو القمر، آیت ۳۱۔ اعراف، آیت ۷۸۔ الحجر، آیات ۸۳-۸۴)

[۱۰۷] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات ۸۰ تا ۸۴۔ ہود، ۷۴ تا ۸۳۔ الحجر، ۵۷ تا ۷۷۔ الانبیاء، ۷۱ تا ۷۵۔ النمل، ۵۴ تا ۵۸۔ العنکبوت، ۲۸-۳۵۔ الصافات، ۱۳۳ تا ۱۳۸۔ القمر، ۳۳ تا ۳۹۔

قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۶۲﴾
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا
عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۴﴾ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوْنَ
مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾
قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِیْنَ ﴿۱۶۷﴾ قَالَ اِنِّیْ
لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّیْنٰهُ

یاد کرو جب کہ ان کے بھائی لوطؑ نے ان سے کہا تھا، ''کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو[۱۰۸] اور تمہاری بیویوں میں تمہارے رب نے تمہارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو[۱۰۹]؟ بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ہو[۱۱۰]۔'' انہوں نے کہا ''اے لوط، اگر تو ان باتوں سے باز نہ آیا تو جو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں اُن میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا[۱۱۱]۔'' اس نے کہا ''تمہارے کرتوتوں پر جو لوگ کڑھ رہے ہیں میں اُن میں شامل ہوں۔ اے پروردگار، مجھے اور میرے اہل و عیال کو ان کی بدکرداریوں سے نجات دے[۱۱۲]۔''

[۱۰۸] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ساری مخلوق میں سے صرف مردوں کو تم نے اس غرض کے لیے چھانٹ لیا ہے کہ ان سے خواہش نفس پوری کرو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا بھر میں ایک تم ہی ایسے لوگ ہو جو شہوت رانی کے لیے مردوں کے پاس جاتے ہو، اس دوسرے مفہوم کی صراحت سورۂ اعراف اور سورۂ عنکبوت میں یوں کی گئی ہے: اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ''کیا تم وہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جو دنیا کی مخلوق میں سے کسی نے تم سے پہلے نہیں کیا؟''

[۱۰۹] اس کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے جو بیویاں خدا نے پیدا کی تھیں انہیں چھوڑ کر تم غیر فطری ذریعے یعنی مردوں کو اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود ان بیویوں کے اندر خدا نے اس خواہش کی تکمیل کا جو فطری راستہ رکھا تھا اسے چھوڑ کر تم غیر فطری راستہ اختیار کرتے ہو۔

[۱۱۰] یعنی تمہارا صرف یہی ایک جرم نہیں ہے۔ تمہاری زندگی کا تو سارا ڈھانچا ہی حد سے زیادہ بگڑ چکا ہے۔ اس عام بگاڑ کی کیفیت {معلوم کرنے کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ النمل، آیت ۵۴۔ العنکبوت، آیت ۲۹۔ الحجر حاشیہ ۳۹}۔

[۱۱۱] یعنی تجھے معلوم ہے کہ اس سے پہلے جس نے بھی ہمارے خلاف زبان کھولی ہے، یا ہماری حرکتوں پر احتجاج کیا ہے، یا ہماری مرضی کے خلاف کام کیا ہے، وہ ہماری بستیوں سے نکالا گیا ہے۔ اب اگر تو یہ باتیں کرے گا تو تیرا حشر بھی ایسا ہی ہوگا۔

[۱۱۲] اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں ان کے اعمال بد کے برے انجام سے بچا۔ اور یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ اس بدکردار بستی میں جو اخلاقی گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کی چھوت کہیں ہماری آل اولاد کو نہ لگ جائے، اس لیے اے پروردگار، ہمیں اس ہر

وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۱۷۲﴾
وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ

آخر کار ہم نے اسے اور اس کے سب اہل وعیال کو بچالیا، بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔[۱۱۳] پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے تباہ کر دیا اور ان پر برسائی ایک برسات، بڑی ہی بری بارش تھی جو اُن ڈرائے جانے والوں پر نازل ہوئی۔[۱۱۴] یقیناً اس میں ایک نشانی ہے،

وقت کے عذاب سے نجات دے جو اس ناپاک معاشرے میں زندگی بسر کرنے سے ہم پر گزر رہا ہے۔

[۱۱۳] اس سے مراد حضرت لوطؑ کی بیوی ہے۔ سورۂ تحریم (آیت ۱۰) میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ''یہ دونوں عورتیں ہمارے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں مگر انہوں نے ان کے ساتھ خیانت کی۔'' یعنی دونوں ایمان سے خالی تھیں اور اپنے نیک شوہروں کا ساتھ دینے کے بجائے ان دونوں نے اپنی کافر قوم کا ساتھ دیا۔

[۱۱۴] اس بارش سے مراد پانی کی بارش نہیں بلکہ پتھروں کی بارش ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت لوطؑ جب رات کے پچھلے پہر اپنے بال بچوں کو لے کر نکل گئے تو صبح پو پھٹتے ہی یکا یک ایک زور کا دھماکا ہوا (فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُشْرِقِیْنَ ۝) ایک ہولناک زلزلے نے ان کی بستیوں کو تل پٹ کر کے رکھ دیا (جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا) ایک زبردست آتش فشانی انفجار سے ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائی گئی (وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ مَّنْضُوْدٍ ۝) اور ایک طوفانی ہوا سے بھی ان پر پتھراؤ کیا گیا (اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ حَاصِبًا)۔

بائیبل کے بیانات، قدیم یونانی اور لاطینی تحریروں، جدید زمانے کی طبقات الارضی تحقیقات اور آثارِ قدیمہ کے مشاہدات سے اس عذاب کی تفصیلات پر جو روشنی پڑتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

بحیرۂ مردار (Dead Sea) کے جنوب اور مشرق میں جو علاقہ آج انتہائی ویران اور سنسان حالت میں پڑا ہوا ہے، اس میں بکثرت پرانی بستیوں کے کھنڈروں کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے کہ یہ کسی زمانہ میں نہایت آباد علاقہ رہا تھا۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس علاقے کی آبادی وخوشحالی کا دَور ۲۳۰۰ قبل مسیح سے ۱۹۰۰ قبل مسیح تک رہا ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مؤرخین کا اندازہ یہ ہے کہ وہ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں گزرے ہیں۔ اس لحاظ سے آثار کی شہادت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ یہ علاقہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بھتیجے حضرت لوطؑ کے عہد ہی میں برباد ہوا ہے۔

اس علاقے کا سب سے زیادہ آباد اور سرسبز وشاداب حصہ وہ تھا جسے بائیبل میں ''سِدّیم کی وادی'' کہا گیا ہے، موجودہ زمانے کے محققین کی عام رائے یہ ہے کہ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے یہ وادی پھٹ کر دب گئی اور بحیرہ مردار کا پانی اس کے اوپر چھا گیا۔ آج بھی یہ بحیرے کا سب سے زیادہ اُتھلا حصہ ہے، اس وقت تک جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبے ہوئے جنگلات صاف نظر آتے ہیں۔ بلکہ یہ شبہ بھی کیا جاتا ہے کہ پانی میں کچھ عمارات ڈوبی ہوئی ہیں۔

بائیبل اور قدیم یونانی ولاطینی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں جگہ جگہ نفط (پٹرول) اور اسفالٹ کے گڑھے تھے اور بعض بعض جگہ زمین سے آتش گیر گیس بھی نکلتی تھی۔ اب بھی وہاں زیرِ زمین پٹرول اور گیسوں کا پتہ چلتا ہے۔ طبقات الارضی مشاہدات سے اندازہ کیا گیا ہے کہ زلزلے کے شدید جھٹکوں کے ساتھ پٹرول، گیس اور اسفالٹ زمین سے نکل کر بھڑک اُٹھے اور سارا علاقہ بھک سے اُڑ گیا۔

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾ ع ۹ ۱۶ ۱۳
كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا
تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾
وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾
اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ

مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ع

اصحابُ الایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔[۱۱۵] یاد کرو جب کہ شعیبؑ نے ان سے کہا تھا "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو ربّ العالمین کے ذمہ ہے۔ پیمانے ٹھیک بھرو اور کسی کو گھاٹا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو

[۱۱۵] اصحاب الایکہ کا مختصر ذکر سورۃ الحجر، آیت ۷۸-۸۴ میں پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا مدین اور اصحاب الایکہ الگ الگ قومیں ہیں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں۔ اس کے برعکس بعض مفسرین دونوں کو ایک ہی قوم قرار دیتے ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اقوال اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ بلاشبہ دو الگ قبیلے ہیں مگر ہیں ایک ہی نسل کی دو شاخیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو اولاد ان کی بیوی یا کنیز قطورا کے بطن سے تھی وہ عرب اور اسرائیل کی تاریخ میں بنی قطورا کے نام سے معروف ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ جو سب سے زیادہ مشہور ہوا، مدیان بن ابراہیم کی نسبت سے مدیانی، یا اصحابِ مدین کہلایا، اور اس کی آبادی شمالی حجاز سے فلسطین کے جنوب تک اور وہاں سے جزیرہ نمائے سینا کے آخری گوشے تک بحر قلزم اور خلیج عقبہ کے سواحل پر پھیل گئی۔ اس کا صدر مقام شہر مدین تھا۔ باقی بنی قطورا جن میں بنی دِدان (Dedanites) نسبتاً زیادہ مشہور ہیں، شمالی عرب میں تیماء اور تبوک اور العلاء کے درمیان آباد ہوئے اور ان کا صدر مقام تبوک تھا جسے قدیم زمانے میں ایکہ کہتے تھے۔

اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کے لیے ایک ہی پیغمبر مبعوث کیے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے، اور ان کے علاقے بھی بالکل ایک دوسرے سے متصل تھے۔ بلکہ بعید نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد ہوں اور آپس کے شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی باہم گھل مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ بنی قطورا کی ان دونوں شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا۔ اور دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی بے ایمانیاں اور مذہبی و اخلاقی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔

حضرت شعیبؑ اور اہلِ مدین کے قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات ۸۵-۹۳۔ ہود ۸۴-۹۵۔ العنکبوت، ۳۶، ۳۷۔

الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ
مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾ قَالُوْٓا
اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ
نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ
كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ
فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾

اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو اور اُس ذات کا خوف کرو جس نے تمہیں اور گزشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے۔'' انہوں نے کہا'' تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے، اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا، اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے۔'' شعیبؑ نے کہا'' میرا رب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو[۱۱۶]۔'' انہوں نے اسے جھٹلا دیا، آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آ گیا،[۱۱۷] اور وہ بڑے ہی خوف ناک دن کا عذاب تھا۔

[۱۱۶] یعنی عذاب نازل کرنا میرا کام نہیں ہے۔ یہ تو اللہ ربّ العالمین کے اختیار میں ہے اور وہ تمہارے کرتوت دیکھ ہی رہا ہے۔ اگر وہ تمہیں اس عذاب کا مستحق سمجھے گا تو خود نازل فرما دے گا۔ اصحاب الایکہ کے اس مطالبے اور حضرت شعیبؑ کے اس جواب میں کفار قریش کے لیے بھی ایک تنبیہ تھی۔ وہ بھی رسول اللہ ﷺ سے یہی مطالبے کرتے تھے، اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا، '' پھر گرا دے ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے'' (بنی اسرائیل، آیت ۹۲)۔ اس لیے ان کو سنایا جا رہا ہے کہ ایسا ہی مطالبہ اصحابُ الایکہ نے اپنے پیغمبر سے کیا تھا، اُس کا جو جواب انہیں ملا وہی محمد ﷺ کی طرف سے تمہاری طلب کا جواب بھی ہے۔

[۱۱۷] اس عذاب کی کوئی تفصیل قرآن مجید میں یا کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ آسمانی عذاب مانگا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک بادل بھیج دیا اور وہ چھتری کی طرح ان پر اس وقت تک چھایا رہا جب تک باران عذاب نے ان کو بالکل تباہ نہ کر دیا۔ قرآن سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اصحابِ مدین کے عذاب کی کیفیت اصحاب الایکہ کے عذاب سے مختلف تھی۔ یہ جیسا کہ یہاں بتایا گیا ہے، چھتری والے عذاب سے ہلاک ہوئے، اور اُن پر عذاب ایک دھماکے اور زلزلے کی شکل میں آیا (فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ اور وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝) اس لیے ان دونوں کو ملا کر ایک داستان بنانے کی کوشش درست نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے عذاب یوم الظُّلَّة کی کچھ تشریحات بیان کی ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کی معلومات کا ماخذ کیا ہے۔ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ من حدثک من العلماء ما عذاب یوم الظلة فکذبه'' علماء میں سے جو کوئی تم سے بیان کرے کہ یوم الظلّہ کا عذاب کیا تھا اس کو درست نہ سمجھو۔''

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ
لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۹۱﴾ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ
الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ
عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً
اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۹۷﴾ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰی بَعْضِ

ع ۱۰ ۱۶ ۱۴ احتیاط

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ع

یہ[۱۱۸] ربّ العالمین کی نازل کردہ چیز ہے۔[۱۱۹] اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار رُوح[۱۲۰] اتری ہے تاکہ تو اُن لوگوں میں شامل ہو جو (خدا کی طرف سے خلقِ خدا کو) متنبہ کرنے والے ہیں، صاف صاف عربی زبان میں۔[۱۲۱] اور اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی یہ موجود ہے۔[۱۲۲] کیا اِن (اہل مکہ) کے لیے یہ کوئی نشانی نہیں ہے کہ اسے علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں؟[۱۲۳] (لیکن اِن کی ہٹ دھرمی کا حال تو یہ ہے کہ) اگر ہم اسے کسی

[۱۱۸] تاریخی بیان ختم کر کے اب سلسلۂ کلام اُسی مضمون کی طرف پھرتا ہے جس سے سورۃ کا آغاز فرمایا گیا تھا۔

[۱۱۹] یعنی یہ "قرآن"، جس کی آیات یہاں سنائی جارہی ہیں، اور یہ "ذکر"، جس سے لوگ منہ موڑ رہے ہیں کسی انسان کی من گھڑت چیز نہیں ہے، بلکہ یہ ربّ العالمین کی نازل کردہ ہے۔

[۱۲۰] مراد ہیں جبریل علیہ السلام، جیسا کہ (البقرہ، آیت ۹۷) میں صراحت سے فرمایا گیا ہے۔ یہاں ان کا نام لینے کے بجائے ان کے لیے روح امین (امانت دار روح) کا لقب استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ رب العالمین کی طرف سے اس تنزیل کو لے کر کوئی مادّی طاقت نہیں آئی ہے جس کے اندر تغیر و تبدل کا امکان ہو، بلکہ وہ ایک خالص روح ہے بلا شائبہ مادیت، اور وہ پوری طرح امین ہے، خدا کا پیغام جیسا اس کے سپرد کیا جاتا ہے ویسا ہی بلا کم و کاست پہنچا دیتی ہے۔

[۱۲۱] اس فقرے کا تعلق "امانت دار روح اتری ہے" سے بھی ہوسکتا ہے اور "متنبہ کرنے والے ہیں" سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ امانت دار روح اسے صاف صاف عربی زبان میں لائی ہے، اور دوسری صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ آں حضرت ﷺ اُن انبیاء میں شامل ہوں جنہیں عربی زبان میں خلقِ خدا کو متنبہ کرنے کے لیے مامور فرمایا گیا تھا، یعنی ہود، صالح، اسماعیل اور شعیب علیہم السلام۔ دونوں صورتوں میں مقصودِ کلام ایک ہی ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ الزخرف، حاشیہ ۱)

[۱۲۲] یعنی یہی ذکر اور یہی تنزیل اور یہی الٰہی تعلیم سابق کتب آسمانی میں بھی موجود ہے۔ اس تعلیم کی کوئی بات بھی ایسی نہیں جو دنیا میں پہلی مرتبہ قرآن ہی پیش کر رہا ہو اور کوئی شخص یہ کہہ سکے کہ تم وہ بات کر رہے ہو جو اگلوں پچھلوں میں سے کسی نے کبھی نہیں کی۔

[۱۲۳] یعنی علمائے بنی اسرائیل اس بات سے واقف ہیں کہ جو تعلیم قرآن مجید میں دی گئی ہے وہ ٹھیک وہی تعلیم ہے جو سابق کتبِ آسمانی میں دی گئی تھی۔ اہل مکہ خود علم کتاب سے ناآشنا سہی، بنی اسرائیل کے اہلِ علم تو گرد و پیش کے علاقوں میں کثرت سے موجود ہیں۔

الْاَعْجَمِیْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ
سَلَكْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ
الْاَلِیْمَ ﴿۲۰۱﴾ فَیَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَیَقُوْلُوْا هَلْ
نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ اَفَبِعَذَابِنَا یَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَیْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ
سِنِیْنَ ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا

عجمی پر بھی نازل کر دیتے اور یہ (فصیح عربی کلام) وہ ان کو پڑھ کر سناتا تب بھی یہ مان کر نہ دیتے۔[۱۲۴] اسی طرح ہم نے اس (ذکر) کو مجرموں کے دلوں میں گزارا ہے۔[۱۲۵] وہ اس پر ایمان نہیں لاتے جب تک کہ عذابِ الیم نہ دیکھ لیں۔[۱۲۶] پھر جب وہ بے خبری میں ان پر آ پڑتا ہے اُس وقت وہ کہتے ہیں کہ ''کیا اب ہمیں کچھ مہلت مل سکتی ہے[۱۲۷]؟'' تو کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ تم نے کچھ غور کیا، اگر ہم انھیں برسوں تک عیش کرنے کی مہلت بھی دے دیں اور پھر وہی چیز ان پر آ جائے جس سے انھیں ڈرایا جا رہا ہے تو وہ سامانِ زیست جو ان کو ملا ہوا ہے

وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی انوکھا اور نرالا ''ذکر'' نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ محمد بن عبداللہؐ نے لا کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہو، بلکہ ہزار ہا برس سے خدا کے نبی یہی ذکر پے در پے لاتے رہے ہیں۔ کیا یہ بات اس امر کا اطمینان کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ تنزیل بھی اسی رب العالمین کی طرف سے ہے جس نے پچھلی کتابیں نازل کی تھیں؟

[۱۲۴] یعنی اب انہی کی قوم کا ایک آدمی انہیں عربی مبین میں یہ کلام پڑھ کر سنا رہا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے، عرب کی زبان سے عربی تقریر ادا ہونے میں آخر معجزے کی کیا بات ہے کہ ہم اسے خدا کا کلام مان لیں۔ لیکن اگر یہی فصیح عربی کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی غیر عرب پر بطور معجزہ نازل کر دیا جاتا اور وہ ان کے سامنے آ کر نہایت صحیح عربی لہجہ میں اسے پڑھتا تو یہ ایمان نہ لانے کے لیے دوسرا بہانہ تراشتے، اس وقت یہ کہتے کہ اس پر کوئی جن آ گیا ہے جو عجمی کی زبان سے عربی بولتا ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو حٰم السجدہ، حواشی ۵۴ تا ۵۸)

[۱۲۵] یعنی یہ اہلِ حق کے دلوں کی طرح تسکین روح اور شفائے قلب بن کر ان کے اندر نہیں اترتا بلکہ ایک گرم لوہے کی سلاخ بن کر اس طرح گزرتا ہے کہ وہ سیخ پا ہو جاتے ہیں اور اس کے مضامین پر غور کرنے کے بجائے اس کی تردید کے لیے حربے ڈھونڈنے میں لگ جاتے ہیں۔

[۱۲۶] ویسا ہی عذاب جیسا وہ قومیں دیکھ چکی ہیں جن کا ذکر اوپر اس سورے میں گزرا ہے۔

[۱۲۷] یعنی عذاب سامنے دیکھ کر ہی مجرموں کو یقین آیا کرتا ہے کہ واقعی پیغمبر نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا۔ اُس وقت وہ حسرت کے ساتھ ہاتھ مل مل کر کہتے ہیں کہ کاش اب ہمیں کچھ مہلت مل جائے، حالانکہ مہلت کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ صلے ق
ذِكْرٰى ۚ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ مع ۹
لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا تَدْعُ عند المتقدمین ۱۲

اِن کے کس کام آئے گا؟[۱۲۸] (دیکھو) ہم نے کبھی کسی بستی کو اِس کے بغیر ہلاک نہیں کیا کہ اُس کے لیے خبردار کرنے والے حق نصیحت ادا کرنے کو موجود تھے۔ اور ہم ظالم نہ تھے۔[۱۲۹]

اِس (کتاب مبین) کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں،[۱۳۰] نہ یہ کام ان کو سجتا ہے،[۱۳۱] اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں۔[۱۳۲] وہ تو اس کی سماعت تک سے دور رکھے گئے ہیں۔[۱۳۳] پس اے نبیؐ،

[۱۲۸] اس فقرے اور اس سے پہلے کے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے سامع کا ذہن تھوڑا سا غور کر کے خود بھر سکتا ہے۔ عذاب کے لیے ان کے جلدی مچانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ عذاب کے آنے کا کوئی اندیشہ نہ رکھتے تھے۔ اسی بنا پر وہ رسول اللہ ﷺ کو چیلنج دیتے تھے کہ لے آؤ اپنا وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے، اچھا اگر بالفرض ان کا یہ خیال صحیح ہی ہو، اگر ان پر فوراً عذاب نہ آئے، اگر انہیں دنیا میں مزے کرنے کے لیے ایک لمبی ڈھیل بھی مل جائے، تو سوال یہ ہے کہ جب بھی ان پر عاد و ثمود یا قومِ لوط اور اصحاب الایکہ کی سی کوئی آفت ناگہانی ٹوٹ پڑی یا اور کچھ نہیں تو موت ہی کی آخری گھڑی آن پہنچی تو اس وقت عیشِ دنیا کے یہ چند سال آخر ان کے لیے کیا مفید ثابت ہوں گے؟

[۱۲۹] یعنی جب انہوں نے خبردار کرنے والوں کی تنبیہ اور سمجھانے والوں کی نصیحت قبول نہ کی اور ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، تو ظاہر ہے کہ یہ ہماری طرف سے ان پر کوئی ظلم نہ تھا۔ ظلم تو اُس وقت ہوتا جب کہ ہلاک کرنے سے پہلے انہیں سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی ہوتی۔

[۱۳۰] یعنی اسے شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں جیسا کہ حق کے دشمنوں کا الزام ہے۔ کفارِ قریش نے نبی ﷺ کے خلاف جو الزامات عوام میں پھیلائے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ محمد ﷺ معاذ اللہ کاہن ہیں اور عام کاہنوں کی طرح ان پر بھی یہ کلام شیاطین القا کرتے ہیں۔

[۱۳۱] یعنی یہ کلام اور یہ مضامین شیاطین کے منہ پر پھبتے بھی تو نہیں ہیں۔ کوئی عقل رکھتا ہو تو خود سمجھ سکتا ہے کہ کہیں یہ باتیں، جو قرآن میں بیان ہو رہی ہیں، شیاطین کی طرف سے بھی ہو سکتی ہیں؟ کیا کبھی تم نے سنا ہے کہ کسی شیطان نے کسی کاہن کے ذریعہ سے لوگوں کو خدا پرستی اور خدا ترسی کی تعلیم دی ہو؟ شرک و بت پرستی سے روکا ہو؟ آخرت کی باز پرس کا خوف دلایا ہو؟ ظلم اور بدکاری اور بداخلاقیوں سے منع کیا ہو؟ نیکوکاری اور راست بازی اور خلقِ خدا کے ساتھ احسان کی تلقین کی ہو؟

[۱۳۲] یعنی شیاطین اگر کرنا چاہیں بھی تو یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے آپ کو انسانوں کے سچے معلم اور حقیقی مزکی کے مقام پر رکھ کر خالص حق اور خالص خیر کی وہ تعلیم دے سکیں جو قرآن دے رہا ہے۔

[۱۳۳] یعنی اس قرآن کے القاء میں دخیل ہونا تو درکنار، جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح الامین اس کو لے کر چلتا ہے اور جس وقت محمد ﷺ کے دل پر وہ اس کو نازل کرتا ہے، اس پورے سلسلے میں کسی جگہ بھی شیاطین کو کان لگا کر سننے تک کا موقع نہیں ملتا۔